امّی کا دن



رضا علی عابدی

امّی کا دن



رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Abidi, Raza Ali
Ammi Ka Din/ Raza Ali Abidi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2016.
24pp.
1. Urdu Literature - Story.
I. Title.

2016ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2938-3
ISBN-13: 978-969-35-2938-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

آر۔آر پرنٹرز، لاہور

امّی کا دن

رضا علی عابدی

عمارت بن کر تیار ہوگئی۔ مزدور اچھی طرح صفائی کر کے چلے گئے۔ اب امان منزل کے بارہ فلیٹوں میں آباد ہونے والے آنے لگے۔ کسی کے ساتھ بہت سامان، کسی کے ساتھ پالتو جانور، کسی کے ساتھ بڑا فرنیچر اور کسی کے ساتھ ڈھیروں برتن۔ بس مزے کی بات یہ تھی کہ ہر کنبے کے ساتھ ایک بچّہ ضرور تھا۔ کوئی چھوٹا، کوئی موٹا، کوئی گود میں سوار، کوئی اپنا گٹار بجاتا ہوا اور کوئی کتابوں کا بھاری بستہ اٹھائے۔

ہر ایک اپنا اپنا فلیٹ دیکھ کر خوش تھا۔ تین نمبر میں آنے والے تو خوشی سے ناچنے لگے۔ سات نمبر والوں نے آتے ہی سب سے پہلے اپنا پہاڑ جیسا ٹیلی وژن لگا کر چلا دیا۔ گیارہ نمبر فلیٹ والے حیران تھے کہ ان کے پڑوس یعنی بارہ نمبر میں کوئی نہیں آیا۔ اسی طرح رات ہوگئی۔ تھکے ہوئے بچے تو فوراً ہی سو گئے۔ جب سنّاٹا چھا گیا تو ایک وین آ کر رُکی۔ اس میں سے ایک کنبہ خاموشی سے اُترا۔ ایک مرد، ایک عورت اور ایک چھ سات برس کا لڑکا، سر پر چترالی ٹوپی، روپہلی سنہری کام والی واسکٹ

اور پیروں میں پشاوری چپل۔ یہ سب اسی اندھیرے میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ خاموشی سے بارہ نمبر فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے۔ لڑکے کی آواز آئی کہ بھوک لگی ہے۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے سب ہی سو گئے۔

صبح ہوئی تو کچھ فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلیں جن سے بچّوں کے سر باہر نکلے۔ وہ سب باہر کا منظر دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دوسرے بچّے بھی باہر جھانک رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے ذرا دور والے لڑکے سے اونچی آواز میں پوچھا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

جواب ملا۔ ''خالد''۔

اب پہلے والے نے پوچھا۔ ''اور تمہارے ابّو کا کیا نام ہے؟''

جواب ملا۔ ''والد''۔

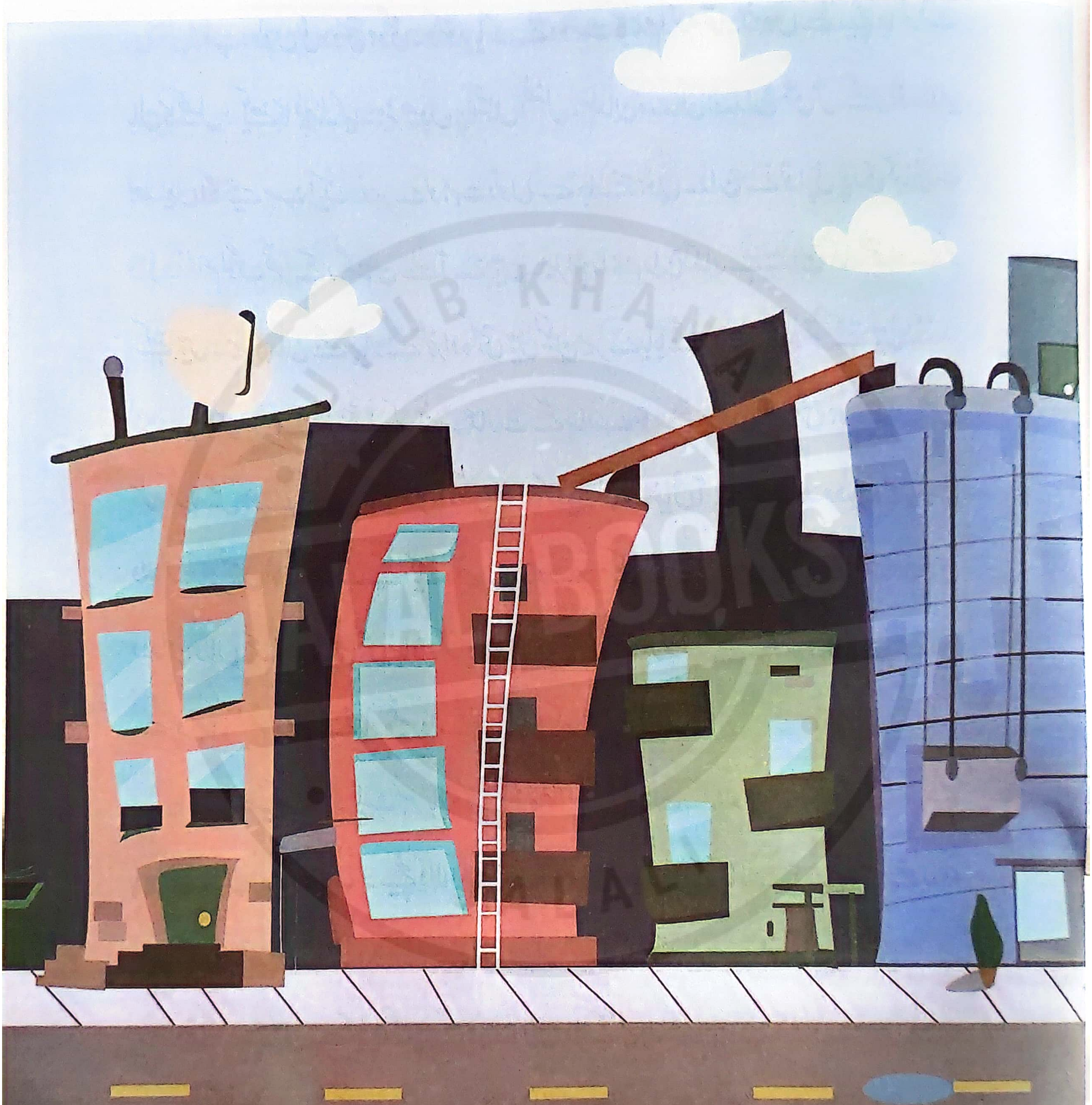
اس پر کئی فلیٹوں سے قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ بچّے حیران تھے کہ اس میں اتنا ہنسنے کی کون سی بات تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ بڑے تو شاید ابھی تک اپنے بستروں میں تھے لیکن بچّے باہر نکلنے لگے۔ عمارت کے بیچوں بیچ دالان تھا۔ کچھ بچّے وہاں جا کر فٹ بال کھیلنے لگے۔ ایک فلیٹ سے ایک لڑکی باہر آئی تو ایک لڑکے نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے بتایا ''وکٹوریہ''۔

لڑکے نے کہا۔ ''کیا تم انگریز ہو؟''

جواب ملا۔ ''نہیں''

لڑکے نے پوچھا۔ ''کیا عیسائی ہو؟''

''نہیں۔ میں مسیحی ہوں۔ ہم لوگ یسوع مسیح کے ماننے والے ہیں''۔



''وہی جنہیں ہم حضرت عیسیٰ کہتے ہیں؟''

اب دونوں کی دوستی ہوگئی۔ وکٹوریا کہ نئے دوست کا نام اکرم تھا۔ انہوں نے نیچے جا کرفٹ بال کا کھیل دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ سیڑھیوں پر انہیں افضل، سلمان، رحمان اور راج بھی مل گئے۔ ذرا دیر بعد یوں لگا جیسے سب ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہوں۔ راج نے تو اپنی پوری کہانی سنا ڈالی۔ ''ہم لوگ تھر کے ریگستان سے آئے ہیں۔ میرا پورا نام راج کمار ہے۔ راج کمار شہزادے کو کہتے ہیں۔ میری ماں مجھے پیار سے شہزادہ کہتی ہیں لیکن میرے بابا مجھے پیار سے بدھّو کہتے ہیں۔''

اس پر سارے بچّے مل کر ہنسے۔ عمارت کے سارے ہی بچّے دالان میں جمع ہو گئے اور گھُل مِل کر باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں دو تین بچّوں کو ایک ساتھ خیال آیا۔ ''ارے۔ وہ بارہ نمبر فلیٹ والا لڑکا باہر نہیں نکلا۔'' سب نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ اُن میں بارہ نمبر والا کوئی نہ تھا۔ اسی دوران وہاں نجمہ اور شاہین بھی نہا دھو کر اور اچھی طرح بال سنوار کر آ گئیں۔ دوسرے بچّوں نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے بارہ نمبر والے لڑکے کو دیکھا؟''۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ فلیٹ نمبر بارہ کا دروازہ کھلا اور وہی رات کے اندھیرے میں آنے والا لڑکا باہر نکلا۔ اس نے جھانک کر نیچے دالان میں دیکھا جہاں عمارت کے سارے ہی بچّے جمع تھے۔ وہ سب ایک ساتھ بولے۔ ''آؤ آؤ۔ نیچے آؤ۔ یہاں آجاؤ''۔ لڑکا سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ بچے اس سے کیا پوچھیں گے۔ وہ خود ہی بولا۔ ''میرا نام دلاور ہے۔''

کئی بچّوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ ''دلاور کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

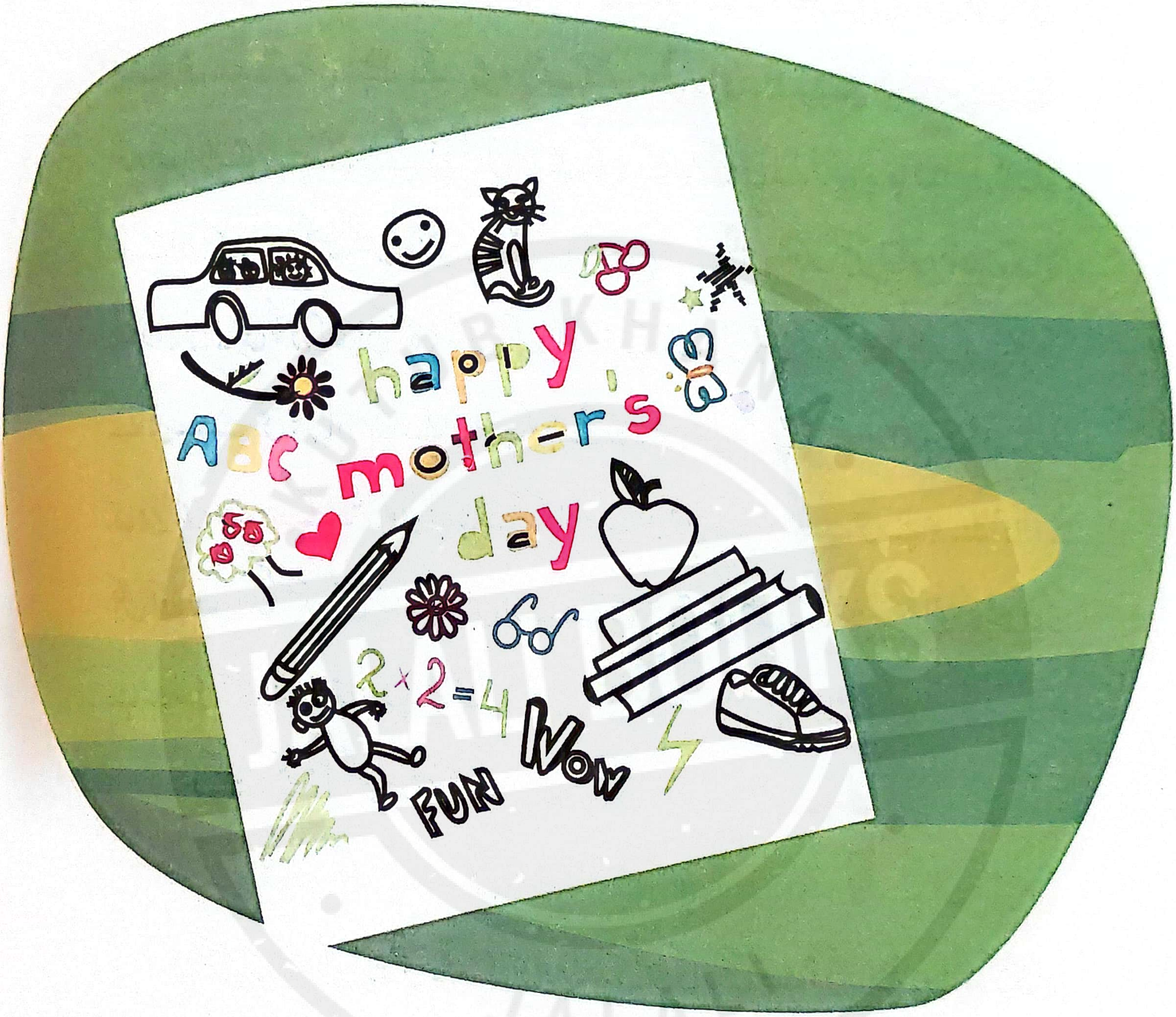
جواب ملا۔ ''بہادر''

بچّے بولے۔ ''دلاور سے تو بہادر اچھا ہے۔ آسان ہے۔ یاد رہے گا''۔

دلاور چھوٹا تھا۔ گھبرا گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بولا۔ ''دیکھو میری پشاوری چپل کیسی چمک رہی ہے۔''۔ سب ہنسنے لگے۔ پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بڑے بچّے ایک دوسرے سے تعارف کراتے رہے۔ چھوٹے بچّے کھیل کود میں لگ گئے۔ لڑکیوں نے فرش پر چاک سے خانے بنائے اور پہل دوج کھیلنے لگیں۔ اُس سے جی بھرا تو رسّی پھاندنے لگیں، تھک گئیں تو 'ہرا سمندر، گوپی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی' گانا شروع کر دیا۔ لڑکے فٹ بال چھوڑ کر کرکٹ کھیلنے لگے۔ دلاور نے جیب سے مٹھی بھر بادام نکالے اور سب کو بانٹنے لگا۔ اس میں کچھ پستے تھے اور اخروٹ بھی۔ ذرا سی دیر میں چٹ ہو گئے۔ مگر یوں مل بانٹ کر کھانا سب ہی کو اچھا لگا۔ سارے ہی بچّے بولے ''دلاور کل اَور لانا، اور کشمش بھی''۔ اتنے میں اوپر سے آوازیں آنے لگیں۔ ''ناشتہ۔ چلو بچّو، ناشتہ تیار ہے۔ جلدی آؤ، انڈا ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔

دیکھتے دیکھتے آنگن سونا ہو گیا۔

مگر یہ ذرا دیر کی بات تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد آنگن کی رونق لوٹ آئی۔ بچّے دوبارہ اکٹھے ہو گئے۔ اس بار کوئی لڑکی اپنی گڑیا لے آئی اور ایک لڑکا اپنی نئی کتابیں لے آیا اور اس کی تصویریں دکھانے لگا۔ ایک لڑکا تو اپنا ہوم ورک لے آیا۔ راج بڑی کلاس کا لڑکا تھا۔ اس نے مدد کر کے ہوم ورک پورا کرا دیا۔ نجمہ اپنے گھر سے گٹار لے آئی اور اسے بجا کر گانے لگی۔ ''کیسے پیارے جگنو۔ کتنے سارے جگنو''۔ پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور بچّے سوچنے لگے کہ سب کو مل کر کوئی اچھا


happy mother's day
ABC
2×2=4
WOW
FUN

سا کام کرنا چاہیئے۔ وکٹوریہ بولی۔ ''میں بتاتی ہوں''۔

سب نے ایک ساتھ پوچھا۔ ''کیا؟''

اس نے کہا۔ ''کل سب اپنے اپنے گھر سے رنگین پنسلیں اور کاغذ لے کر آنا۔ پھر میں ایک مزے کا کام بتاؤں گی''۔

بس یہ طے ہوگیا اور اپنے اپنے فلیٹوں کو لوٹ جانے کا وقت ہوگیا۔

اگلے روز سارے لڑکے لڑکیاں طرح طرح کے رنگ اور کاغذ لے کر آ گئے۔ مگر یہ کیا؟ دلاور خالی ہاتھ آیا اور رونی صورت بنا کر آیا۔ سب نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کے گھر میں نہ کاغذ ہے اور نہ رنگ۔ یہ سننا تھا کہ سارے بچّوں نے اپنے فالتو کاغذ اور رنگین پنسلیں اس کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اب وکٹوریہ کو بتانا تھا کہ اس نے یہ سب کیوں منگایا ہے۔ وکٹوریا نے تو چھوٹی سے تقریر کر ڈالی۔ ''دیکھو بھئی۔ اگلے ہفتے مدرز ڈے یعنی امّی کا دن منایا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ ہم سب بھی مل کر یہ دن منائیں، اپنی اپنی امّی سے تھینک یو کہیں، ان کا جی بہلائیں اور انہیں بتائیں کے ہم انہیں کتنا چاہتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' وکٹوریہ کا یہ کہنا تھا کہ ہر طرف سے آواز آئی۔ ''ہاں ہاں۔ ہم سب مدرز ڈے منائیں گے''۔ بس تو پہلا کام یہ ہوگا کہ آج سارے بچّے اپنی اپنی امّی کے لئے خوب صورت سے رنگین کارڈ تیار کریں گے اور مدرز ڈے کی صبح چپکے سے امّی کے سرہانے رکھ دیں گے''۔

بس دیکھتے دیکھتے کارڈ تیار ہونے لگے۔ کسی پر پھول، کسی پر خود امّی، کسی پر امّی کی گود میں

بچّہ اور کسی کارڈ پر پھول پتیاں اور چڑیاں۔ دلاور نے بہت کوشش کی مگر وہ بے چارہ کچھ نہ بنا سکا، بس پھر کیا تھا۔ اس کے کارڈ پر نجمہ نے ایک پتّی بنائی، شاہین نے دوسری پتّی بنائی، راج نے چھوٹی سے چڑیا بنائی۔ افضل نے منّا سا پھول بنایا، سلمان اور رحمان نے دلاور سے پوچھا کہ تمہارے کارڈ پر کیا لکھا جائے۔ دلاور نے کہا ''لکھو، امّی آپ دنیا کی سب سے پیاری امّی ہیں''۔ اس پر سارے ہی بچّے خوش ہو گئے اور سب نے کہا کہ اپنے اپنے کارڈ پر وہ بھی یہی لکھیں گے۔ سارے کے سارے سر جھکا کر رنگا رنگ کارڈ بنانے لگے۔

کارڈ بناتے بناتے خالد کو ایک خیال آیا۔ اس نے کہا کہ مدرز ڈے پر ایک چھوٹا سا جلسہ کریں، اس میں ہم سب اپنی اپنی امّی کو بلائیں اور ان سے اچھی اچھی باتیں کر کے ان کا دل بہلائیں اور انہیں خوش کریں''۔

یہ وہی خالد ہے جس سے کسی نے اس کے باپ کا نام پوچھا تھا اور اس نے کہا تھا 'والد'۔

اب ایک مزے کی بات ہوئی۔ خالد کے والد اوپر اپنے فلیٹ کے باہر کھڑے بچّوں کی باتیں سن رہ تھے۔ انہوں نے وہیں سے کہا کہ میری دکان میں بیس تیس کرسیاں موجود ہیں۔ جلسے کے لئے وہ کرسیاں یہاں آ سکتی ہیں، مگر وہ یہاں آئیں گی کیسے؟ اچانک فلیٹ نمبر بارہ کے دروازے سے آواز آئی۔ ''فکر نہ کرو۔ ساری کرسیاں میری وین میں آ جائیں گی''۔ راج کے والد بھی بچّوں کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی کہ وہ مدرز ڈے کے مہمانوں کے لئے اپنی دکان سے سموسے، نمک پارے اور مٹھائی بھجوا دیں گے۔

اب سوچو اس روز مہمانوں میں کون کون ہوگا، سارے لڑکوں اور لڑکیوں کی مائیں۔ اوپر

کے فلیٹوں سے کہی جانے والی باتیں سن کر سارے بچّے تالیاں بجانے لگے۔ دلاور کے والد بولے" بچّو۔ ہم اس روز پستے بادام اور اخروٹ بھیجیں گے"۔ اب اور زور زور سے تالیاں بجیں اور اکرم بولا" اور کشمش بھی"۔

بچّے یہ سوچ کر خوش تھے کہ مدرز ڈے پر اچھا خاصا جلسہ ہو جائے گے۔ اب سوال یہ تھا کہ اُس روز سب مل کر کیا کریں گے۔ کسی نے کہا کہ سب اپنی اپنی امّی کے گلے میں ہار ڈالیں گے، نجمہ کا خیال تھا کہ سب مل کر 'ماں پیاری ماں' گائیں گے۔ رحمان کے والد بہت اچھے فوٹو گرافر تھے۔ اس نے کہا کہ ہم سب مل کر اپنی "امّی لوگ" کے ساتھ تصویریں اتروائیں گے۔ سلمان جواب تک خاموش تھا بالکل یوں بولا جیسے کوئی تقریر کرتا ہے۔ "لوگو۔ میری بات سنو اور دھیان سے سنو۔ مدرز ڈے کے جلسے میں ہم سب باری باری تقریر کریں گے اور اپنی اپنی امّی کی کوئی بات، کوئی قصّہ یا کوئی کہانی سنائیں گے اور سب خوش ہو کر تالیاں بجائیں گے"۔ سلمان کی اس بات پر کچھ دیر کو خاموشی چھائی۔ پھر ایک طرف سے آواز آئی۔ 'ہاں مجے ایک قصہ یاد آ گیا'۔ پھر دوسری آواز آئی۔ 'اور مجھے بھی اپنی امّی کی ایک پیاری سی کہانی یاد آ گئی'۔ پھر کئی آوازیں آئیں 'مجھے بھی۔ میں بھی۔ میری کہانی بھی۔ میری امّی کا قصّہ بھی'۔

دلاور خاموش بیٹھا تھا۔ وکٹوریہ نے اس سے کہا۔ "دلاور تمہیں اپنی امّی کی کوئی بات یاد ہے؟"۔ دلاور بولا۔ "ابھی پوچھ کر آتا ہوں"۔ سارے بچّے بولے۔ "نہیں نہیں، ابھی نہیں"۔

چلئے یہ بھی طے ہو گیا۔ بچّوں کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔

اس عمارت میں روز صبح کا منظر بہت مزے کا ہوتا تھا۔ سب بڑے اپنے اپنے کاموں پر اور بچے اپنے اسکولوں کو جاتے تھے لیکن سب سے زیادہ مزا اُس وقت آیا جب عمارت کے تین یا چار بچوں کے لیئے ان کے اسکول کی جو وین آئی، بچے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وین کو کوئی اور نہیں، دلاور کے ابا گُل خان چلا رہے تھے۔ کچھ بچوں کو ان کے والدین اسکول لے گئے، کچھ خود ہی پیدل چل کر گئے اور اب رہ گئے ہمارے دلاور خان، اُن کا اسکول ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور انہیں پڑھانے کے لئے ماسٹر جی گھر آتے تھے۔

روز صبح کام پر جانے والوں کی کہانی بھی مزے کی ہے۔ کوئی اپنی دکان پر جاتا، کوئی اپنے دفتر، کوئی اپنی پولیس ڈیوٹی پر اور کوئی اپنی ٹرین چلانے۔ دلاور کے والد گل خاں اپنی اسکول کی وین لے کر صبح ہی نکل جاتے اور پہلے بچوں کو ان کے گھروں سے لے کر اسکول پہنچاتے اور چھٹی ہونے پر ان ہی بچوں کو احتیاط اور حفاظت سے ان کے گھروں کو پہنچاتے۔ ان کا بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ وکٹوریہ کے والد ہوائی اڈّے پر کام کرتے تھے اور راج کے والد شہر میں مٹھائی، دودھ اور دہی کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر یہ سب لوگ تھوڑے ہی دنوں میں گھل مل گئے۔ اب رہ گئیں مائیں، وہ سب کی سب یا تو بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں یا گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی تھیں۔ کبھی فرصت ملتی تو آپس میں مل بیٹھتی تھیں۔

پھر ہوا یہ کہ یہ دن گزر گئے اور مدرز ڈے آ گیا، امّی کا دن، ماں کو تھینک یو کہنے کا دن۔ ساری مائیں سو کر اٹھیں تو دیکھا کہ ان کے سرہانے مدرز ڈے کے کارڈ رکھے ہیں جو بچوں نے

اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور ان پر لکھا تھا۔ ''آپ دنیا کی سب سے پیاری امّی ہیں''۔ ایک لڑکے نے لکھا۔ ''بس میرے کان نہ کھینچا کیجئے''۔ ایک اور لڑکے نے لکھا۔ ''روز بھنڈی نہ پکایا کیجئے''۔

تھوڑی دیر میں گُل خان کرسیاں اور میزیں لے آئے جو آنگن میں لگادی گئیں۔ اس کے بعد سموسے، نمک پارے اور برفی ٹرے میں لگ کر آ گئی جسے رنگین کاغذ سے ڈھانپا گیا تھا۔ بچے بھی اپنا بہترین لباس پہن کر نیچے اترے اور میز کرسیاں قاعدے سے لگا دیں۔ راج کی ماں کو برفی بہت پسند تھی، وہ سب سے پہلے نیچے آئیں۔ پھر ہر ایک کی امّی آنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے جلسہ شروع ہو گیا۔ کچھ بچے یہ سوچ کر گھبرا رہے تھے کہ انہیں تقریر کرنی ہوگی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی۔ کچھ بچّوں کا خیال تھا کہ پہلے بڑے بچّے بولیں گے تاکہ انہیں دیکھ کر چھوٹے بچّوں کے ہمّت بڑھے۔ یہی ہوا۔ راج عمر میں سب سے بڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بولا کہ پہلے میں ماں کی ایک کہانی سناؤں گا۔ گھبرانے والے بچّے اب آرام سے بیٹھ گئے۔ راج نے پہلے تمام ماؤں کو مدرز ڈے کی مبارک باد دی اور پھر اپنی کہانی شروع کی:

''ہمارا گاؤں سندھ کی سرحد پر تھر کے ریگستان میں ہے۔ وہاں زندگی کی کوئی سہولت نہیں، پانی مشکل سے ملتا ہے اور کھانا لکڑیوں پر پکتا ہے۔ وہاں یہ ہوا کہ ایک روز پڑوس کے لڑکے لڑکیاں میرے گھر آئے اور کہنے لگے کہ آج لکڑیاں چننے نہیں چلوگے۔ میں گھر میں بیکار بیٹھا تھا، فوراً ہی تیار ہو گیا اور ہم سب گاؤں سے دور جنگل میں سوکھی لکڑیاں تلاش کرنے جا پہنچے۔ اس روز بہت زیادہ گرمی تھی اور ہم لوگ اپنے ساتھ پانی بھی نہیں لائے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ہونٹ سوکھ

گئے اور زور کی پیاس لگی۔ اوپر سے ہم نے لکڑیاں بھی اٹھا رکھی تھیں۔ ہمارے ساتھ جو چھوٹے لڑکے تھے وہ تو رونے لگے۔ ہم دعا مانگ رہے تھے کہ راستے میں کوئی تالاب یا کنواں مل جائے تا کہ ہم اپنی پیاس بجھائیں۔ اتفاق سے ہمارا گھر ایک ٹیلے کے اوپر تھا جہاں سے ریگستان دور تک نظر آتا تھا۔ وہاں سے میری امّی نے ہم لوگوں کو دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ ہم مشکل میں ہیں۔ انہوں نے پانی کا جگ اور گلاس اٹھایا اور ہماری طرف دوڑنے لگیں۔ ہمارے پاس آتے ہی انہوں نے ہم سب کے سروں سے لکڑیاں اتاریں اور جلدی جلدی پانی پلانے لگیں۔ وہ ہمیں بہلاتی ہوئی گھر لے گئیں اور مٹکے سے پانی نکال کر مجھے نہلایا۔ وہ اپنی زبان میں مجھے دعا دیتی جاتی تھیں کہ میرے بیٹے، تجھے کبھی گرم ہوا بھی نہ لگے۔ وہ دن جب بھی یاد آتا ہے، دل یہ ضرور کہتا ہے کہ اتنی پیاری امّی تو کسی کی بھی نہ ہوں گی“۔

سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ اب کس کی باری ہے، یہ سوچ کر بچّے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وکٹوریا نے کہا کہ اب وہ اپنی امّی کا ایک قصہ سنائے گی۔ پھر تالیاں بجیں۔ وکٹوریہ بہت خوب صورت بال بنا کر آئی تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی ماں بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ اب وکٹوریا نے بولنا شروع کیا:

”میری ممی بڑی کمال کی ہیں۔ ہر کام اور ہر بات اس طرح کرتی ہیں کہ نہ کوئی ناراض ہوتا ہے نہ برا مانتا ہے۔ اب سنئے میری کہانی۔ میرے اسکول کی ایک لڑکی ہر سال امریکہ جایا کرتی تھی اور وہاں سے بہت سی کتابیں لایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے کچھ کتابیں مجھے بھی دیں۔ میں یہ کتابیں اپنے کمرے میں رکھتی اور جب ممی مجھے لٹا کر اور شب بخیر کہہ کر چلی جاتیں تو انہیں دیر تک

پڑھتی۔ ایک رات وہ تھوڑی ہی دیر بعد واپس کمرے میں آئیں اور میرے ہاتھ سے کتاب لے کر بڑے پیار سے کہا: ''دیکھو بیٹی، اگر تم دیر تک جاگیں اور پھر صبح تمہاری آنکھ نہ کھلی تو میں ناراض ہوں گی اور کچھ کہوں گی تو تمہیں بُرا لگے گا۔ بیٹی، صبح صبح ناراض ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سارا دن افسوس رہتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ کر اسکول بھیجا۔ کون سی ماں اپنے بچّے کو ڈانٹ کر اسکول بھیجنا چاہتی ہے۔ ہاں، جس صبح چھٹّی ہو اُس رات جتنا جی چاہے پڑھو، میں کچھ نہ کہوں گی''۔ پھر ممی نے میرے کمرے کی بتّی بجھائی، پردے برابر کیے، میرے ماتھے پر سے بال ہٹا کر پیار کیا اور شب بخیر کہہ کر چلی گئیں۔

خوب تالیاں بجیں۔ وکٹوریہ کی ماں حیران تھیں کہ ان کی بیٹی نے یہ واقعہ اب تک یاد رکھا ہے۔ سب ہی تقریر کی تعریف کر رہے تھے کہ دلاور کی آواز آئی۔ ''سمو سے کب ملیں گے''۔ ماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اسے چپ کر دیا۔

اگلی باری اکرم کی تھی۔ وہ دیر تک گلا صاف کرتا رہا۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''ایک رات بڑے بھائی صاحب کے پیٹ میں درد اٹھا۔ کافی رات ہو گئی تھی اور ڈاکٹر کا ملنا مشکل تھا۔ ماں رات بھر بھائی کے سرہانے بیٹھی روتی رہیں اور ان کا سر دباتی رہیں۔ میں یہ سارا منظر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ماں بھائی صاحب کو زیادہ چاہتی ہیں۔ اگر میرے پیٹ میں درد ہوتا تو یہ مزے سے سوتی رہتیں۔ اتفاق سے ایک شام مجھے بخار ہوا۔ بخار اتنا تیز تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ پتا نہیں مجھے کب ہوش آیا لیکن جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ماں میرے قریب بیٹھی آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر میرا بچّہ بچ گیا تو سات غریبوں کو کھانا کھلاؤں گی۔

میرے بدن میں قوت نہیں تھی لیکن ماں کا یہ حال دیکھ کر میں اٹھ بیٹھا اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس وقت ماں کو آنسو پونچھتے اور مسکراتے دیکھ کر مجھے احساس ہو کہ ماں کی محبت عجب دولت ہے جو بانٹنے سے کم نہیں ہوتی۔''

پھر تالیاں بجیں اور رحمان نے ، جو عمر میں چھوٹا تھا، کہا کہ اب وہ تقریر کرے گا۔ ایک دوسرے کو بولتا دیکھ کر بچّوں کے دل سے خوف جاتا رہا۔ رحمان نے کہا۔ ''جن دنوں کی یہ بات ہے میری امّی بہت بیمار رہتی تھیں۔ اسی لئے وہ مجھے اپنے پاس سُلا نہیں سکتی تھیں لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس سلائیں۔ ایک رات میں بہت ضد کر کے ان کے پاس سو گیا۔ بعد میں مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے سوچا کہ اٹھ جاؤں کیونکہ امّی کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ لیکن انہیں نے مجھے اٹھنے نہ دیا اور تھپک تھپک کر اپنے پاس سلائے رکھا۔ انہیں دو دن سخت تکلیف رہی لیکن انہوں نے میری آرزو پوری کر دی۔ کتنی پیاری ہیں میری امّی''۔

ایک بار پھر تالیاں بج رہی تھیں کہ دلاور کی آواز آئی۔ ''امّی بھوک لگی ہے''۔ اس پر بہت سی ماؤں نے کہا۔ ''ہاں بھئی، اب یہ مزے مزے کی چیزیں کھالی جائیں، سموسے ابھی گرم ہیں اور ان کی خوش بو بہت اچھی ہے''۔

اس پر ناشتے کا وقفہ ہو گیا۔

اب کس کی باری ہے؟ سلمان نے ہاتھ اٹھایا اور اس نے کھڑے ہو کر اپنے پریشانی کے دنوں کی کہانی شروع کی۔ ''اُن دنوں ابا کے کاروبار میں بہت نقصان ہوا اور ہمارے گھر میں فاقے شروع ہوگ ے۔ بس اتنا تھا کہ روز بازار سے ایک کیلو چاول آتے تھے جن سے میں، میرا چھوٹا بھائی



اور ماں باپ دو وقت پیٹ بھرا کرتے تھے۔ میرے والد ہم پر بہت سختی کرنے لگے تھے۔ میرے امتحان قریب آئے تو انہوں نے بڑی مشکل سے امتحان کی فیس کی رقم دی۔ بد قسمتی سے وہ رقم راستے میں کہیں گر گئی۔ میں روتا ہوا گھر آیا تو ماں نے جلدی سے مجھے گلے لگالیا اور میرے رونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے بتایا کہ فیس کے پیسے کھو گئے ہیں۔ اتنا سنتے ہی میں نے فوراً کھانے کے آدھے چاول بیچ دیئے اور میری بات کو چھپائے رکھنے کے لئے خود دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ ایسی پیاری ہیں میری امّی''۔

سلمان کی تقریر سن کر سب کو دکھ تو ہوا لیکن امّی کی قربانی کی بات پر سب نے اس کی امّی کی طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ سلمان کے بعد نجمہ نے کہا کہ اب وہ امّی کی ایک کہانی سنائے گی۔ سب لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ نجمہ یوں بولنے لگی جیسے ریڈیو پر خبریں سنائی جاتی ہیں مگر اس کا یہ انداز سب کو اچھا لگا۔ وہ بولی۔ ''ویسے تو میں بہت سیدھی ہوں لیکن سب گھر والے مجھے کبھی شیطان کہتے ہیں اور کبھی شیطان کی خالہ۔ یہ بات دو تین سال پہلے کی ہے۔ میں کھیل رہی تھی کہ امّی کی آواز آئی۔ وہ مجھے پکار رہی تھیں۔ میں نے ایک پل کو کچھ سوچا اور پھر میں دبے پاؤں اسٹور روم میں الماری کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ امّی مجھے پکارتی ہوئی آئیں لیکن میں نہیں ملی۔ انہوں نے پڑوس میں پوچھا۔ جب وہاں بھی میرا پتہ نہ چلا تو امّی پریشان ہو گئیں اور گھبرا کر بکسوں کے پیچھے، پلنگوں کے نیچے، سب جگہ ڈھونڈنے لگیں۔ بعد میں وہ پلنگ پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ جب میں نے امّی کو روتے دیکھا تو میں ہنستی کھلکھلاتی باہر نکل آئی۔ امّی نے مجھے دیکھا تو دوڑ کر گلے لگالیا اور پیار کرنے لگیں۔ انہوں نے مجھے ایسے بھینچ کر چمٹایا جیسے پھر کوئی مجھے چھین کر لے جائے گا۔ دیکھا، میری

امّی کتنی پیاری ہیں''۔

خوب تالیاں بجیں۔ پھر آواز لگی کہ اب کون بولے گا۔ تین چار بچے رہ گئے تھے جو اپنے گھر والوں کی آڑ میں جا چھپے۔ دلاور کی ماں نے کہا کہ اب میرا بچہ بولے گا۔ دلاور بھی جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پتہ نہیں کیوں، یوں لگا کہ ماں نے اسے تقریر یاد کرائی ہے۔ اس کی باتوں میں وہی بچپن کا بھولپن تھا، اور سچّائی بھی۔ ''یہ بات مجھے میری امّی نے بتائی ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ ایک روز امّی کی گود میں لیٹا تھا کہ اچانک مجھے زور کی ہچکی آئی اور ذرا دیر کے لئے میری سانس رک گئی۔ امّی سمجھیں کہ یہ میری زندگی کی آخری ہچکی تھی۔ وہ بری طرح گھبرا گئیں اور مجھے گود میں اٹھا کر ننگے پاؤں اسپتال کی طرف دوڑیں۔ وہاں ڈاکٹروں نے مجھے دیکھا اور کوشش کر کے اپنی ہنسی روکی۔ انہوں نے کہا کہ فکر نہ کیجئے، آپ کا بچّہ بالکل ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے مجھے کھلانے کے لئے کچھ میٹھی گولیاں دیں۔ تب امّی کو چین آیا۔ مجھے اتنا چاہتی تھیں میری امّی''۔

اس پر خالد بولا۔ ''میں ڈاکٹر ہوتا تو تمہیں کھلانے کے لئے نمک پارے دیتا''۔ سب ہنسے اور دلاور کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے تالیاں بجائیں۔ باقی بچّے اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ انہوں نے تقریر سے انکار کر دیا۔ آخر میں وکٹوریہ نے اپنا گٹار بجا کر چھوٹا سا گانا گایا:

میری امّی سب سے پیاری، سب سے انوکھی، سب سے نیاری۔

جیسے ہی جلسہ ختم ہوا اور سب لوگ کھڑے ہوئے، ان سب کے ابّا جان بھی اپنے اپنے فلیٹوں سے اتر کر نیچے آ گئے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ راج کے والد اجے کمار کی دکان سے آئے ہوئے


Lorem ipsum dolor sit amet,
consectetaur adipiscing elit, sed do
NEWS
Lorem ipsum dolor sit amet consectetaur adipiscing

کافی سموسے اور مٹھائی ابھی باقی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سب کچھ چٹ ہو گیا مگر کسی نے یہ نہ دیکھا کہ اتنی دیر میں دلاور نے کچھ نمک پارے اپنی جیب میں بھر لئے۔ اس کے والد اپنے بیٹے کی تقریر سن کر بہت خوش تھے۔ وہ اس جگہ گئے جہاں کھڑے ہو کر بچے تقریر کر رہے تھے اور اونچی آواز میں بولے۔ سنو بھائیو، سنو۔ کل چرچ میں مدرز ڈے کا میلہ ہے۔ میں اپنے بیٹے کو وہاں لے جاؤں گا۔ اگر اور کوئی بچہ چلنا چاہے تو میری وین میں میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ کون کون چلے گا۔ ہاتھ اٹھاؤ" یہ سننا تھا کہ بچوں نے وہیں اپنے ماں باپ سے اجازت لے کر ہاتھ اٹھا دیئے۔ گُل خان نے کہا "بس تو کل چار بجے تیار رہنا۔ ہم سب میلے میں چلیں گے"۔

اگلے دن بچوں نے صبح ہی سے میلے کی تیاری شروع کر دی۔ اچھے اچھے کپڑے نکالے اور نہانا دھونا شروع ہو گیا۔ ابھی چار نہیں بجے تھے کہ بچے اپنے اپنے فلیٹوں سے نکل کر نیچے آ گئے۔ آخر میں کون آیا؟ ننھا دلاور سونے چاندی کے تاروں والی واسکٹ، سر پر چترالی ٹوپی اور پاؤں میں پشاوری چپل (خوب چمکتی ہوئی)۔ ذرا دیر میں گل خان کی وین اسٹارٹ ہوئی۔ بچوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا اور وہ سارے کے سارے چرچ کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں تو بہت رونق تھی۔ ہر ایک بن سنور کر آیا تھا۔ امّی کا دن تھا اس لئے بہت سی عورتیں آئی تھیں۔ بچے اکثر ماں کی انگلی تھامتے ہیں، اُس روز امّی کا دن تھا اس لئے بچوں نے ماؤں کی انگلیاں تھام رکھی تھیں۔ کچھ لوگ گا رہے تھے، کہیں کٹھ پتلی کا تماشا ہو رہا تھا۔ دلاور نے پہلی بار پنچ اینڈ جوڈی شو دیکھا تو ڈر گیا۔ مار پیٹ سے اسے ویسے ہی چڑ تھی۔ ایک آدمی جادوگری کے تماشے دکھا رہا تھا۔

اس نے اپنے سر سے ہیٹ اتارا جس کے اندر سے ایک کبوتر نکلا اور اُڑ گیا۔ اس نے کبوتر کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تو سب ہی ہنسنے لگے۔

گل خان کو بچّوں کی دیکھ بھال کرنے اور ان کا خیال رکھنے کا کام خوب آتا تھا۔ وہ سب کو گھیرے ہوئے یوں چل رہے تھے جیسے مرغی اپنے چوزوں کو سب سے بچا کر رکھتی ہے۔ میلے کی رونق بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک گُل خان جہاں تھے وہیں ٹھہر گئے۔ یوں لگا جیسے وہ ڈر رہے ہوں۔ انہوں نے بچّوں کو اور قریب کر لیا اور بولے۔ ''بچّو۔ چلو۔ جلدی سے۔ یہاں سے نکل چلو''۔

سارے بچّے بھی سہم گئے اور بولے ''کیا ہوا انکل؟''۔

''یہاں سے چلو۔ یہاں ایک بُرا آدمی آ گیا ہے''۔

دلاور نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور بولا۔ ''وہ کالی قمیص والا؟''

گل خان نے اسے خاموش کر دیا اور بچّوں کو ساتھ لے کر اپنی وین کی طرف لپکنے لگے۔ وین میں بیٹھتے ہی سارے بچّوں نے ان پر سوالوں کی بارش کر دی۔ ''کون تھا انکل۔ کتنا بُرا آدمی تھا۔ کیا وہ چور تھا۔ کیا ڈاکو تھا؟''

دلاور نے پوچھا۔ ''کیا وہ بم لگانے آیا تھا؟

گل خان چلّائے۔ ''خاموش''

وہ اپنی وین تیز تیز چلانے لگے۔ میلے کے گیٹ پر بچّوں نے دیکھا کہ پولیس افسر کے ساتھ سپاہیوں کی ایک ٹولی کھڑی ہے۔ گل خان کی وین اُن کے سامنے سے گزرتی ہوئی ذرا سست رفتار

ہوئی تو سارے بچّوں نے وین کی کھڑکیوں سے گردنیں باہر نکال کر ان سے کہا۔ ''میلے میں ایک خطرناک آدمی آ گیا ہے۔ جا کر اسے پکڑیئے۔ کالی قمیص والا ہے''۔ اب دلاور کی آواز آئی۔ اس نے پولیس والوں سے کہا ''اس آدمی کے پاس بم ہے''۔

یہ سننا تھا کہ پولیس افسر نے سپاہیوں کو کچھ حکم دیا اور وہ دوڑ پڑے۔ بچّوں نے اپنی وین کی کھڑکیوں سے دیکھا کہ سپاہی ایک آدمی کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔ اس نے کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ مگر گُل خان نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور اپنی گاڑی دوڑا دی۔

اگلے روز اخباروں میں بہت بڑی خبر چھپی۔

''مدرز ڈے کا میلہ بڑی تباہی سے بچ گیا۔ بم لگانے والا دہشت گرد پکڑا گیا۔ بچّوں نے پولیس کو خبردار کیا۔ انہیں انعام دیا جائے گا''۔

کچھ ہی دیر بعد اخبار والے، چرچ والے، کمشنر کے دفتر والے اور پولیس والے بچّوں کو تلاش کرتے ہوئے اور بڑے بڑے گُل دستے اٹھائے امان منزل پہنچ گئے۔ وہاں تو دھوم مچ گئی۔ خالد کے والد نے ان کا استقبال کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ اس عمارت کے بچّوں کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ دس کے دس بچّے وہیں بلا لئے گئے جنہیں پھول پیش کئے گئے، اخبار والے سینکڑوں سوال کرنے لگے۔ دلاور انہیں تفصیل بتانے چلا تھا، ماں نے اسے پیچھے ہی روک لیا۔ اخبار والوں نے ان سب کی تصویریں اتاریں جو اگلے روز کے اخباروں میں چھپنی تھیں۔

یہی ہوا۔ اخباروں کے پہلے صفحوں پر سات لڑکوں اور تین لڑکیوں کی بڑی بڑی تصویریں

چھپیں۔ ہر گروپ فوٹو میں سوچیے سب سے آگے کون کھڑا تھا؟: سنہرے روپہلے کام والی واسکٹ، چترالی ٹوپی اور پشاوری چپّل پہنے ہمارا دلاور، جس کی پشاوری چپّل آج کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھی۔

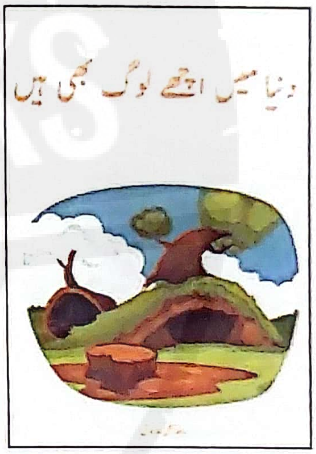
ایک ستون کی آڑ سے گُل خان جھانکتے نظر آ رہے تھے۔

رضا علی عابدی صحافی ہیں۔ انہوں نے پندرہ سال اخباروں میں اور تیس برس سے زیادہ عرصے ریڈیو میں کام کیا۔ وہ پندرہ برس کے تھے جب انہوں نے بچوں کے لئے لکھنا شروع کیا اور پہلے پہل کہانیاں لکھیں۔ اخبار کی ملازمت سے پہلے وہ کراچی سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے نونہال پاکستان کے لئے کام کرتے رہے۔ اخبار کے بعد وہ بی بی سی لندن سے وابستہ ہوئے جہاں انہوں نے دس سال تک بچوں کا بہت مقبول پروگرام 'شاہین کلب' پیش کیا۔ اس پروگرام کے مرکزی کردار سدھو بھائی تھے جو بچوں کو ہنسانے اور ان کا دل بہلانے کی باتیں کرتے تھے اور پورے پورے کنبے ان کی باتیں شوق سے سنا کرتے تھے۔

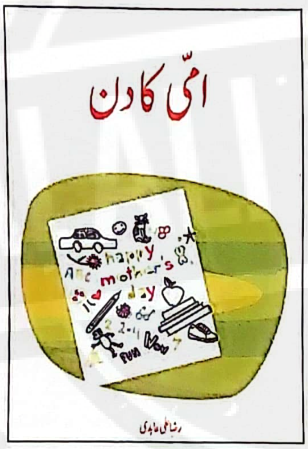
بی بی سی سے ریٹائر ہو کر رضا علی عابدی نے بچوں کے لئے پندرہ کتابیں لکھیں جن میں الف بے پے سکھانے والے قاعدے اور کہانیاں شامل تھیں۔ ان کی لکھی ہوئی کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں، پہلا تارا۔ پہلی کرن۔ الٹا گھوڑا۔ ظالم بھیڑیا۔ پیاری ماں۔ میری امی۔ مُن مُن۔ چمپا۔ کمال کے آدمی۔ چوری چوری چپکے چپکے۔ بندر کی الف بے پے۔ گنگناتا قاعدہ۔ قاضی جی کا اچار۔

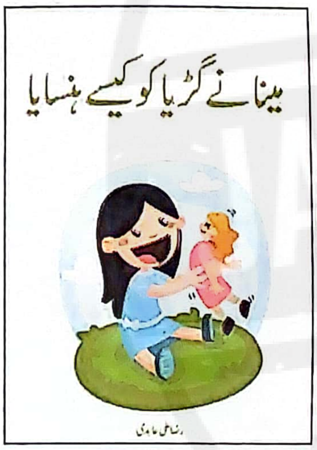
جس سلسلے کی یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں ان کے لکھے ہوئے بچوں کے تین ناول، منّا پور۔ اچھے لوگ اور امّی کا دن اور ان کے علاوہ تین کہانیوں کا ایک مجموعہ شامل ہے۔ ان سب میں پیار محبت سے مل کر رہنے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ہاتھ بٹانے کا سبق ملتا ہے۔

رضا علی عابدی لندن میں رہتے ہیں۔ ان کے تین بچے اور اور چھ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں۔









HRCP

فیض فاؤنڈیشن ٹرسٹ

Faiz Foundation Trust

A project funded by European Union

Partner

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2938-3
ISBN-13: 978-969-35-2938-8
9789693529388

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور